بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جب کسی بدنصیب شخص کے پاؤں دو کشتیوں میں ٹکے ہوئے ہوں اور انہیں کھینے والے انہیں دو متضاد سمتوں میں لے جانے کا عزم رکھتے ہوں تو ان میں پاؤں رکھنے والا اگر ساحلِ مراد پہ پہنچنے کے بجائے لہروں کی نذر ہو جائے تو یہ انتہائی دکھ کی بات تو ضرور ہے مگر کسی اعتبار سے باعث حیرت نہیں۔ انسان کو استعجاب تو اس بات پہ ہوتا ہے جو توقع کے بالکل برعکس ظہور پذیر ہو لیکن اگر نتیجہ، خواہ کتنا ہی ندوہناک ہو، توقع کے عین مطابق برآمد ہو رہا ہو تو انسان اُسے دیکھ کر کرب تو محسوس کرتا ہے مگر حیرت زدہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آپ کراچی جانے کا عزم کرتے ہیں اور اس غرض کے لیے کراچی کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور اپنی دانست میں کراچی جانے والی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کا آغاز کرتے ہیں اور آٹھ دس گھنٹے گذر جانے کے بعد آپ پہ یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آپ کراچی کے بجائے پشاور کے قریب پہنچ رہے ہیں تو اس انکشاف سے آپ نہ صرف پریشان ہوں گے بلکہ حیرت زدہ بھی ہوں گے کیونکہ آپ منزلِ مقصود سے قریب تر ہونے کے بجائے اس سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔

قریب قریب یہی ذہنی افتاد ان انسانی قافلوں یا جماعتوں پر پڑتی ہے جو چند مخصوص مصالح کے تحت عوام کی زیادہ سے زیادہ بھیڑ اپنے ارد گرد جمع کرنے کی غرض سے ایسے نعرے لے کر اُٹھتے ہیں جو الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے کے نقیض ہوتے ہیں۔ ایسی جماعتیں یا گروہ اگر چند قدم چلنے کے بعد انتشار کا شکار ہو جائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ خلفشار سے محفوظ رہ جائیں تو اس پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ متوقع نتیجہ ظاہر ہونے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔

ہمارے ملک میں یوں تو کوئی ایسی سیاسی جماعت معرضِ وجود میں نہیں آئی جس نے نظریاتی اساس پر اپنے آپ کو منظم کر کے عوام کے اندر اثر و نفوذ پیدا کیا ہو اور پھر عوام کی تائید سے مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئی ہو لیکن خاص طور پر سکندر مرزا کے عہدِ اقتدار سے جتنی سیاسی جماعتیں بھی تختِ اقتدار پر براجمان ہوئی ہیں وہ خود اقتدار کی پیداوار ہیں جنہیں کسی صاحبِ اختیار نے اپنی ضرورت کے لیے منظم کیا اور جب اس کی وہ ضرورت پوری ہوگئی تو وہ خود بخود اس طرح معدوم ہوگئیں کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ سکندر مرزا اپنے عہدِ اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دینے اور اپنے اختیارات کو غیر محدود بنانے کے لیے وہ سارے حربے استعمال کرتا رہا جو اس کے پیش رو ملک غلام محمد نے کیے تھے۔ لیکن اس نے یہ محسوس کیا کہ جب تک کوئی سیاسی جماعت اس کی باندی بن کر اس کی خدمت اور چاکری کا فرض انجام دینے کے لیے میدان میں نہ اُترے اس وقت تک اس کے دلپسند سیاسی عزائم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس غرض کے لیے اُس نے ریپبلکن پارٹی کی تشکیل کی۔ ظاہر بات ہے کہ جو جماعت نہ تو کسی صحت مند نظریے کی بنیاد پر اور نہ کسی رفیع و اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر معرضِ وجود میں آئے بلکہ جس کی تشکیل کی غایت صرف یہ ہو کہ کسی صاحبِ اختیار کے لیے بطور آلہ کار استعمال کی جاسکے وہ جماعت ملک و ملّت کی بہبود کے لیے کیا کام کرسکتی ہے۔ چنانچہ اس پارٹی کا دائرہ کار سکندر مرزا اور اس کے حواریوں کی مدح و ستائش تک محدود رہا اور جب "بڑے صاحب" مسندِ اقتدار سے محروم ہوگئے تو اس پارٹی کا وجود بھی عنقا ہوگیا۔

سکندر مرزا کے بعد مارشل لا کے ذریعہ عنانِ اقتدار پاکستان کی بری فوج کے سربراہ کے ہاتھ میں منتقل ہوئی۔ یہ صاحب چار برس تک مارشل لا کی اندھی بہری قوت سے تنہا امورِ مملکت چلاتے رہے لیکن جب ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں اپنے کارناموں کی تعریف و توصیف کے لیے اور عوام کے ذہنوں پر اپنی شخصیت کا طلسم قائم کرنے کے لیے کچھ پیشہ ور قصیدہ خوانوں، کچھ زوردار نعرہ لگانے والوں، اور ان کے لیے جلسے منعقد کر کے انہیں سپاس نامے پیش کرنے والوں کی ضرورت ہے جو ہر لحہ اور ہر حال میں اُن کے دعاگو ہوں بلکہ ان کی حمد و ثنا کو جزوِ ایمان سمجھتے ہوں، تو انہوں نے مسلم لیگ میں سے ایک حصّہ الگ کر کے کنونشن لیگ کے نام سے ایک نئی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اعلان کا ہونا تھا کہ اقتدار کے پجاری اور دنیوی مفادات کے پرستار جو فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کی قربت اور سرپرستی حاصل کرتے

کے لیے سخت بیتاب تھے وہ جوق در جوق اس جماعت میں شامل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ارکان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں تک جا پہنچی۔ ہر سطح پر جماعت کے چھوٹے بڑے لیڈر ابھرنے لگے اور سرکاری اخبارات میں اُن کے بیانات جو الفاظ کے معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ سربراہ مملکت کے حضور میں اپنی نیازمندی کا یقین دلانے کے لیے ہی ہوتے تھے، نمایاں طور پر شائع ہونے شروع ہوئے۔ کنونشن لیگ کے کارکنوں اور اُن کے قائدین کی سرگرمیوں کو اخبارات میں دیکھ کر ایک عام تاثر یہی پیدا ہوتا تھا کہ اس جماعت کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی سرگرمیاں پوری زندگی پر محیط ہیں اور اس کی جڑیں عوام کے دل و دماغ میں اچھی طرح اُتر چکی ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب کی ہمہ مقتدر ذات بھی اس خوش فہمی میں گرفتار نظر آتی تھی لیکن جو لوگ سیاسی معاملات کی کوئی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ اس جماعت کو اپنے سارے شکوہ کے باوجود محض ریت کا ایک گھروندا سمجھتے تھے جو فیلڈ مارشل صاحب کے اقتدار کے ساتھ قائم تھا اور اُن کے تختِ اقتدار سے ہٹتے ہی درہم برہم ہونے والا تھا۔ ان حضرات کے یہ خدشات حقائق کے گہرے مطالعہ پر مبنی تھے جن کا تذکرہ آج بھی اتنا ہی ضروری معلوم ہوتا ہے جتنا کہ پہلے ادوار میں۔

نوعِ انسانی کی طویل تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسانوں کی پائیدار شیرازہ بندی کے لیے یہ بات ازحد ضروری ہے کہ یہ شیرازہ بندی کسی صحت مند نظریاتی اساس پر کی جائے۔ اس حقیقت کی طرف اس عارف ربانیؓ نے اُن پرآشوب حالات میں جب اس کائنات کی عظیم ترین ہستی دنیا سے رخصت ہوئی، یہ کہہ کر اشارہ فرمایا:

ایها الناس، انه من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات، ومن کان یعبد الله فان الله حی لا یموت۔	اے لوگو! (جان لو) کہ جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا اسے سمجھ لینا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاچکے ہیں اور جو کوئی اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اللہ زندہ جاوید ہے اور اسے موت نہیں آتی۔

ان الفاظ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کچھ نہیں

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول
اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	بھی گذر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل
عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ۔	کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤگے

آل عمران - ۱۴۴

خلیفہ راشدؓ کی اس تصریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندہ و پائندہ رہنے والی چیز صحت مند اصول اور نظریہ ہے، کسی فرد کی زندگی نہیں ۔ فرد کو بھی اگر حیات جاوید ملتی ہے تو اُس نظریے اور اصول کے طفیل جسے وہ اپنی ناسوتی زندگی میں سربلند کرنے کے لیے اپنی ساری قوتیں اور توانائیاں کھپا دیتا ہے۔ انسانیت کے ارتقاء اور ترقی میں فرد کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ عظیم افراد کی قوتِ فکر، جوشِ عمل اور ایثار ہی سے نظریات اور اصولوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ان عظیم افراد کی عظمت کا راز بھی اس بات میں مضمر ہے کہ ان حضرات نے اپنے ان اصول و نظریات کو، جن پر وہ ایمان رکھتے تھے، دنیا کی غالب قوت بنانے کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کر دی اور اگر انہیں اس راہ میں زندگی کی بازی بھی لگانا پڑی تو انہوں نے اس سے قطعاً گریز نہ کیا بلکہ اُسے اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اس انکسار کے ساتھ جان نثار کی گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جو افراد، جماعتیں یا گروہ اصول و نظریات سے وابستگی پیدا کرنے کے بجائے اشخاص سے وابستہ رہنا پسند کرتے ہیں خصوصاً جب وہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوں، ممکن ہے وہ اپنے لیے چند حقیر قسم کے مادی فوائد حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو جائیں لیکن وہ ملک و ملت کے لیے ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ہر چڑھتے ہوئے سورج کا پرستار نہ صرف اپنی تذلیل کا سامان فراہم کرتا ہے بلکہ انسان کی تذلیل کا باعث بنتا ہے اور خود سورج کے لیے بھی کوئی نیک فال ثابت نہیں ہوتا۔ "آفتاب" کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی کرنوں کا مختلف طبقات پر کیا ردِّ عمل ہوتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنی کرنوں کو زیادہ سے زیادہ حیات آفرین بنانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کے غروب ہو جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی یاد باقی رہے۔ لیکن اگر ہر طلوع ہونے والا آفتاب پرستاروں کے جھرمٹ ہی میں طلوع ہوا اور جب تک اس کے غروب

ہونے کے آثار بالکل نمایاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک وہ لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہی دیکھے تو اسے اپنی اس "خدمت جلیلہ" کے بارے میں عوام کے صحیح ردّعمل کا کس طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اقتدار کا آفتاب جس انداز سے چاہتا ہے عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بیچارے دم بخود ہو کر اس کے زوال کے منتظر رہتے ہیں اور جب وہ زوال سے دوچار ہو جاتا ہے تو انہیں اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے۔ اس نیازمندانہ بلکہ احمقانہ طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چند سالوں ہی میں پوری قوم بے ضمیر افراد کا ٹولہ بن کر رہ جاتی ہے جو ہر بُرائی کو اپنے آپ پر مسلّط کرنے پر تیار نظر آتی ہے بشرطیکہ وہ بُرائی اقتدار کے ہاتھوں اس کی طرف منتقل ہو رہی ہو۔

آپ قوموں کے عروج و زوال کی داستان پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ کسی قوم کو عروج اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے افراد کسی نظریے کی صحت پر ایمان لا کر اور اُس کے ساتھ سچی وابستگی پیدا کر کے اور عزم راسخ کے ساتھ اس کے غلبے کے لیے بھرپور جدوجہد شروع کریں اور اسے زوال اس وقت آتا ہے جب اس نظریے سے اُن کی دلبستگی ختم ہونے لگے اور دنیوی مفادات کا حصول ان کا منتہائے مقصود بن جائے۔ مادی مفادات کا پرستار لازمی طور پر اقتدار کا پجاری ہوتا ہے کیونکہ ان مفادات کا سب سے بڑا سرچشمہ اقتدار ہی ہوتا ہے۔ مفادات اور اقتدار کی پرستش سے افراد کی سیرتیں کمزور، اُن کے عزائم پست اور قومی سطح پر اُن کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اخلاقی امراض کسی قوم کو اسی طرح کھوکھلا کر دیتی ہیں جس طرح تپ دق کا مرض کسی انسان کی توانائی چاٹ لیتا ہے۔ یہ انحطاط اگرچہ دفعتاً نمودار نہیں ہوتا لیکن معمولی بصیرت رکھنے والے لوگ بھی ان اخلاقی اور روحانی عوارض سے اس بات کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ قوم جسے یہ مرض لاحق ہے وہ سرنگوں ہونے والی ہے اور اس زوال سے اسے کوئی معاشی تدبیر یا کوئی سیاسی شعبدہ بازی نہیں بچا سکتی۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ مسلمانوں کو کس روگ نے تباہ کیا ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے دعوے کے باوجود اس سے بے رغبتی اور دنیاوی مفادات کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی رغبت اور دلچسپی یہ ایک ایسا روگ ہے جس نے اس "امت" کو خدا اور خلق

دونوں کی نظروں میں رسوا کیا ہے۔ خدا کی نظر میں تو ہم اس لیے ذلیل ہیں کہ زبان کی حد تک تو ہم اس بات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں کہ اے خالق تو ہی ہمارا الٰہ اور معبود ہے، تیرا عطا کردہ دین ہی ہماری دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا ضامن ہے، تیرا رسول ہی ہدایت کا واحد سرچشمہ ہے اور اس کی محبت اور پیروی ہی سے ہم دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہوسکتے ہیں لیکن ان بدیہی حقائق کے اعتراف کے بعد جب ہم زندگی کے عملی میدان میں اُترتے ہیں تو ہم اپنے اعمال سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمیں خدا کی رضا مطلوب نہیں بلکہ مادی مفادات عزیز ہیں۔ ہم اپنے خالق اور مالک کی نظرِ کرم کے محتاج نہیں بلکہ اقتدار کی نگاہ التفات کے دست نگر ہیں، ہماری کامیابی اور کامرانی دینِ حق کی اطاعت سے وابستہ نہیں بلکہ ان افکار و نظریات کی رہینِ منت ہے جو ہمارے اصحابِ اقتدار اور ان کے منظورِ نظر دانشوروں نے اہل مغرب سے مانگ تانگ کر ہمیں دیے ہیں۔ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پہ ناز نہیں بلکہ مغربی ملحدین کی دریوزہ گری پر فخر ہے۔ قول و فعل کا یہ خوفناک تضاد ہماری بربادی اور ذلت و خواری کا واحد سبب ہے۔ خدا ہم سے اس لیے ناراض ہے کہ ہم اس کے ساتھ جو عہد و پیمان باندھتے ہیں اسے ہر قدم پہ توڑتے ہیں اور خلق ہم سے اس لیے خفا ہے کہ ہم اپنی زندگی کا کوئی اصول اور نظریہ نہیں رکھتے۔ ہم متضاد نعروں اور متضاد طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم کسی اصول کے علمبردار نہیں بلکہ بے ضمیر افراد کا ایک ٹولہ ہیں جسے اقتدار کے اشارہ ابروئے چشم پہ رقص کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کی تربیت حاصل نہیں۔ اس قسم کے طالع آزماؤں کے لیے کسی دل میں عزت و احترام کا کونسا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ دنیا کی یہ ریت ہے کہ یہاں ایک با اصول کافر کی پذیرائی تو ہوسکتی ہے کیونکہ اس کی اصول پرستی کی بنا پر اس پر کسی حد تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے لیکن ایک بے اصول اور بے ضمیر خدا پرستی کے اُس دعویدار کے لیے عزت کا کوئی مقام پیدا نہیں ہوسکتا جس کے اعمال اس کے دعوے کی تردید کرنے والے ہوں۔ جو شخص خدا کے مقدس نام پر لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز نہیں رہتا اس پر خدا کی مخلوق کس طرح اعتماد کرسکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں جس قدر رفعت اور سربلندی خدا پرست قوموں کو حاصل ہوتی ہے وہ ملحد اقوام کو حاصل نہیں ہوئی لیکن جب ان مذہبی قوموں نے خدا پرستی کے مسلک کو چھوڑ کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنایا تو جس قدر ذلت و خواری اِن قوموں کے حصے میں آئی اس کی نظیر دوسری قوموں میں کم ہی ملتی ہے۔

پاکستان جو بڑی مقدس آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا تھا اسے نفاق کے اس جان لیوا

مرض نے ہی تباہ کیا ہے۔ اس نیم برصغیر کے مسلمانوں نے خدا اور خلق دونوں کو گواہ بنا کر یہ اقرار کیا تھا کہ اگر انہیں ایک الگ خطۂ ارضی حاصل ہو جائے تو وہ اسے اسلام کا گہوارہ بنائیں گے لیکن جن افراد کے ہاتھوں میں اس ملک کی عنانِ اقتدار رہی انہوں نے اس بات کی سرتوڑ کوشش کی کہ اس ملک پر کسی طرح اسلامی نظام کی پرچھائیں نہ پڑنے پائیں۔ اہلِ پاکستان کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہاں جو جماعت اور گروہ اقتدار کے حصول کے لیے آگے بڑھا اس نے اسلام کے نام پر مسندِ اقتدار پر قبضہ کیا لیکن جس وقت اسے یہ مقام حاصل ہو گیا تو پھر اس نے حکومت کے سارے وسائل اسلام کی راہ روکنے کے لیے صرف کرنے شروع کر دیے۔ اس قسم کا طرزِ عمل انتشار اور خلفشار تو پیدا کر سکتا ہے، اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دو چار سال کی حکمرانی کے بعد جب وہ گروہ رسوا ہو کر اقتدار سے محروم ہوا تو پھر اقتدار کے نئے امیدواروں نے اسلام کی خدمت کے نام پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی اور جب اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تو اس نے بھی خدمتِ اسلام کے بجائے اسلام کے خلاف سازشوں کا وسیع جال پھیلا دیا۔

بعض لوگ حکمرانوں کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے یہ مسلمان فرمانروا برسرِ اقتدار آجانے کے بعد اسلام کے خلاف معاندانہ روش کیوں اختیار کرتے ہیں؟ یہ سوال بظاہر بڑا معقول نظر آتا ہے لیکن حالات کے سطحی مطالعے اور غلط تجزیے پر مبنی ہے۔ اسلام کی "محبت کا دم بھرنے والوں" کی زندگیاں اقتدار سے پہلے بھی خدا کے باغیوں کا نقشہ پیش کرتی ہیں اور انہیں دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ اس نوعیت کی زندگیاں بسر کرنے والے خدا کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا جو کمال ہے وہ صرف یہ کہ ایک کامیاب فنکار کی طرح عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لیے بوقتِ ضرورت اسلام اور قرآن سے اپنی شیفتگی ظاہر کرتے رہتے ہیں اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کے دین سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیتے ہیں البتہ بیزاری کا اظہار بھی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے کیا جاتا ہے تاکہ عام لوگوں کو اس کا احساس نہ ہو۔ مثلاً یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام دورِ جدید کے مسائل کو بطریقِ احسن حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہ اب قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا جامہ ہے جسے عہدِ حاضر کی قامت پر راست نہیں (باقی برصفحہ ۴)

(بقیہ اشارات) کیا جا سکتا۔

پھر اسلام کے ان عقیدت مند حکمرانوں کی دینِ حق سے انحراف کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس نہج پر ڈھالنے کے لیے آمادہ نہیں پاتے، جس کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ اس بنا پر اُن کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسلام کے ساتھ ان کی محبت صرف تقریروں اور بیانات تک محدود رہے اور انہیں اس محبت کے نتیجے میں عملاً کچھ نہ کرنا پڑے۔ دینِ حق کے بارے میں یہ طرزِ عمل کسی صحت مند طرزِ فکر کی نشاندہی نہیں کرتا۔

اسلام کے معاملے میں پیپلز پارٹی کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ دین سے جو بیزاری پہلے محتاط جملوں کی صورت میں سامنے آتی تھی اب وہ اس کی کاوشوں سے نعروں کی صورت میں ڈھل کر اور منشور کے اندر تحلیل ہو کر عوام کے سامنے آنے لگی ہے۔ "اسلام ہمارا دین ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے" کا نعرہ اپنے معانی اور مضمرات کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایک پارٹی اللہ کے دین کی وسعت اور جامعیت کا انکار کرتے ہوئے یہ بات برملا کہتی ہے کہ خدا کا لایا ہوا دین معیشت اور سیاست کے معاملے میں ہمیں کوئی رہنمائی نہیں دے سکتا۔ حیاتِ انسانی کے ان دائروں میں سوشلزم اور مغربی جمہوریت ہی ہماری دستگیری کر سکتے ہیں۔ اس پارٹی کے بعض دانشور اپنے اس کارنامے پر بڑا اتراتے ہیں کہ انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کر کے اسلام کے معاملے میں اس منافقانہ روش کو ختم کیا ہے جو ان کے پیشرو عرصہ دراز سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرات جس منافقت کا شکار ہیں وہ پہلی قسم کی منافقت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ اِس میں قول و فعل کے تضاد کے علاوہ ایک خوفناک قسم کا فکری انتشار بھی پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے تو وہ درحقیقت اسلام اور کفر کو یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہی یہ تاویل کہ وہ جس سوشلزم کے پرچارک ہیں وہ اسلام کے تابع ہے تو یہ اسی قسم کی سخن طرازی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ وہ جس بُت پرستی کا علمبردار ہے وہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے۔ سوشلزم کے یہ پُرجوش مبلغ ہر وقت اپنے ناقدین پر برستے رہتے ہیں اور جو دعوے کی حد تک نفاق سے نفرت کا اظہار کرتے رہتے ہیں وہ خود نفاق کے مرض میں گرفتار ہیں۔ کیا یہ دورنگی اور منافقت نہیں کہ ایک انسان سوشلزم اور اس کے نظریات اور معتقدات کا پرستار ہو اور اس بنا پر وہ ان تمام افراد، قوموں اور اداروں کو مٹانے کے درپے ہو جو سوشلزم کی راہ کا سنگ گراں ثابت ہو سکتے ہوں

لیکن عوام کے احساسات کے پیش نظر وہ سوشلزم کا نعرہ بلند کرتے ہوئے یہ کہے کہ میرے نزدیک اس کا مطلب عدل و انصاف کے وہ تصورات ہیں جن کی اسلام نے نشاندہی کی ہے۔ یہ اسلام کے بارے میں منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ان حضرات کے بارے میں یہ سوئے ظن نہیں ہو سکتا کہ وہ اس اصطلاح کے معانی و مطالب سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسی بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ اشتراکیت عدل و انصاف اور احسان کا نام نہیں بلکہ انسانوں پر اجتماعیت کی جھوٹی خدائی قائم کرنے کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، انسان بحیثیت فرد کسی مرتبہ و مقام کا حامل نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس کے کوئی مستقل اور پائیدار حقوق ہیں — اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی معاشرے کی ہیئت حاکمہ اس سے جو کام لینا چاہے وہ بلا چون وچرا کرتا چلا جائے اور اسے جس حال میں رکھنا گوارا کرے وہ اسی حال پر قانع رہ کر زندگی کی سرحد کو عبور کر جائے۔ الغرض وہ ہیئت حاکمہ کے لیے جیے اور اسی کی خدمت اور چاکری میں مرے۔ نمرود کی خدائی کی اس سے زیادہ بھیانک صورت کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی مظلوم فرد یا طبقہ نہ تو ظلم کو ظلم کہہ سکے اور نہ ظلم کے خلاف کوئی آواز اٹھا سکے اور اگر کبھی وہ اس غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے معاشرے اور اجتماعی مفادات کا باغی گردان کر ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اشتراکیت انسانی فلاح و بہبود کی کوئی تحریک نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف یہ ایک خطرناک سازش ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی دینی معاشرے میں جو مقام خدا کو حاصل ہوتا ہے اس مقام پر ملک کی ہیئت حاکمہ کو فائز کر دیا جائے اور انسان اس کے ساتھ اسی نوعیت کا رشتۂ عبودیت استوار کریں جس طرح کہ خدا پرست اپنے خالق اور مالک کے ساتھ استوار کرتے ہیں۔